QuranUrdu.com

تفہیم القرآن

الدخان

(۴۴)

QuranUrdu.com

الدخان

نام

آیت نمبر ۱۰: یَوۡمَ تَاۡتِی السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِیۡنٍ کے لفظ دُخان کو اس سورت کا عنوان بنایا گیا ہے، یعنی یہ وہ سورت ہے جس میں لفظِ دُخان وارد ہوا ہے۔

زمانۂ نُزُول

اِس کا زمانۂ نُزول بھی کسی معتبر رِوایَت سے معلوم نہیں ہوتا، مگر مضامین کی اندرونی شہادت بتاتی ہے کہ یہ بھی اُسی دَور میں نازل ہوئی ہے جس میں سورۂ زُخرُف اور اس سے پہلے کی چند سورتیں نازل ہوئی تھیں، البتہ یہ اُن سے کچھ مُتأخِّر ہے۔ تاریخی پَس منظر یہ ہے کہ جب کفارِ مکہ کی مخالفانہ رَوِش شدید سے شدید تر ہوتی چلی گئی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی کہ خدایا! یوسفؑ کے قحط جیسے ایک قحط سے میری مدد فرما۔ حضورؐ کا خیال یہ تھا کہ جب اِن لوگوں پر مصیبت پڑے گی تو انھیں خدا یاد آئے گا اور ان کے دل نصیحت قبول کرنے کے لیے نرم پڑ جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی دُعا قبول فرمائی اور سارے علاقے میں ایسے زور کا قحط پڑا کہ لوگ بِلبلا اُٹھے۔ آخر کار بعض سردارانِ قریش، جن میں حضرت عبداللہؓ بن مسعود نے خاص طور پر ابوسُفیان کا نام لیا ہے، حضورؐ کے پاس آئے اور آپؐ سے درخواست کی کہ اپنی قوم کو اس بلا سے نجات دلانے کے لیے اللہ سے دُعا کریں۔ یہی موقع ہے جب اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی۔

موضوع اور مَباحِث

اس موقع پر کفارِ مکہ کی فہمایش اور تنبیہ کے لیے جو خطبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا گیا، اس کی تمہید چند اہم مباحث پر مشتمل ہے:

اوّل، یہ کہ تم لوگ اس قرآن کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف سمجھنے میں غَلَطی کر رہے ہو۔ یہ کتاب تو اپنی ذات میں خود اِس امر کی بَیِّن شہادت ہے کہ یہ کسی انسان کی نہیں بلکہ خداوندِ عالَم کی کتاب ہے۔

دوسرے، یہ کہ تم اس کتاب کی قدر و قیمت سمجھنے میں بھی غلطی کر رہے ہو۔ تمھارے نزدیک یہ ایک بلا ہے جو تم پر نازل ہوگئی ہے۔ حالانکہ درحقیقت وہ گھڑی انتہائی مبارک گھڑی تھی جب اللہ تعالیٰ نے سراسر اپنی رحمت کی بنا پر تمھارے ہاں اپنا رسول بھیجنے اور اپنی کتاب نازل کرنے کا فیصلہ فرمایا۔

تیسرے، یہ کہ تم اپنی نادانی سے اس غلط فہمی میں پڑے ہوئے ہو کہ اس رسول اور اِس کتاب سے لڑ کر تم جیت جاؤ گے۔ حالانکہ اِس رسول کی بِعْثَت اور اس کتاب کی تنزیل اُس ساعتِ خاص میں ہوئی ہے جب اللہ تعالیٰ قسمتوں کے فیصلے فرمایا کرتا ہے۔ اور اللہ کے فیصلے بودے نہیں ہوتے کہ جس کا جی چاہے انھیں بدل ڈالے، نہ وہ کسی جَہالت و نادانی پر مبنی ہوتے ہیں کہ ان میں غلطی اور خامی کا کوئی احتمال ہو۔ وہ تو اُس فرماں روائے کائنات کے پختہ اور اٹل فیصلے ہوتے ہیں جو سمیع و علیم اور حکیم ہے۔ اُن سے لڑنا

QuranUrdu.com

کوئی کھیل نہیں ہے۔

چوتھے، یہ کہ اللہ کو تم خود بھی زمین و آسمان اور کائنات کی ہر چیز کا مالک و پروردگار مانتے ہو، اور یہ بھی مانتے ہو کہ زندگی و موت اسی کے اختیار میں ہے۔ مگر اس کے باوجود تمھیں دوسروں کو معبُود بنانے پر اصرار ہے اور اس کے لیے حجت تمھارے پاس اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ باپ دادا کے وقتوں سے یہی کام ہوتا چلا آ رہا ہے۔ حالانکہ اگر کوئی شخص شُعور کے ساتھ یہ یقین رکھتا ہو کہ اللہ ہی مالک و پروردگار اور زندگی و موت کا مختار ہے تو اسے کبھی یہ شبہ تک لاحق نہیں ہو سکتا کہ معبُود ہونے کے مستحق اُس کے سوا یا اس کے ساتھ دوسرے بھی ہو سکتے ہیں۔ تمھارے باپ دادا نے اگر یہ حماقت کی تھی تو کوئی وجہ نہیں کہ تم بھی آنکھیں بند کر کے اسی کا ارتکاب کرتے چلے جاؤ۔ حقیقت میں تو اُن کا رب بھی اکیلا وہی خدا تھا جو تمھارا رب ہے، اور اُنھیں بھی اسی ایک کی بندگی کرنی چاہیے تھی جس کی بندگی تمھیں کرنی چاہیے۔

پانچویں، یہ کہ اللہ کی رُبوبیت و رحمت کا تقاضا صرف یہی نہیں ہے کہ تمھارا پیٹ پالے، بلکہ یہ بھی ہے کہ تمھاری رہنمائی کا انتظام کرے۔ اِسی رہنمائی کے لیے اُس نے رسول بھیجا ہے اور کتاب نازل کی ہے۔

اس تمہید کے بعد اُس قحط کے معاملے کو لیا گیا ہے جو اُس وقت درپیش تھا۔ جیسا کہ ہم اُوپر بیان کر چکے ہیں، یہ قحط نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اِستِدعا پر آیا تھا، اور حضورؐ نے اس کے لیے دُعا اس خیال سے کی تھی کہ مصیبت پڑے گی تو کفار کی اکڑی ہوئی گردنیں ڈھیلی پڑ جائیں گی، شاید کہ پھر حرفِ نصیحت ان پر کارگر ہو۔ یہ توقع اس وقت کسی حد تک پوری ہوتی نظر آ رہی تھی، کیونکہ بڑے بڑے ہیکڑ دشمنانِ حق کال کے مارے پکار اُٹھے تھے کہ پروردگار! یہ عذاب ہم پر سے ٹال دے تو ہم ایمان لے آئیں گے۔ اِس پر ایک طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا ہے کہ ایسی مصیبتوں سے یہ لوگ کہاں سبق لینے والے ہیں۔ اِنھوں نے جب اُس رسول کی طرف سے منہ موڑ لیا جس کی زندگی سے، جس کے کردار سے اور جس کے کام اور کلام سے عَلانِیَہ ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ یقیناً خدا کا رسول ہے، تو اب محض ایک قحط اِن کی غفلت کیسے دُور کر دے گا۔ دوسری طرف کفار کو مخاطَب کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ تم بالکل جھوٹ کہتے ہو کہ یہ عذاب تم پر سے ٹال دیا جائے تو تم ایمان لے آؤ گے۔ ہم اِس عذاب کو ہٹائے دیتے ہیں، ابھی معلوم ہوا جاتا ہے کہ تم اپنے اس وعدے میں کتنے سچّے ہو۔ تمھارے سر پر تو شامت کھیل رہی ہے۔ تم ایک بڑی ضرب مانگ رہے ہو، ہلکی چوٹوں سے تمھارا دماغ دُرست نہیں ہوگا۔

اسی سلسلے میں آگے چل کر فرعون اور اس کی قوم کا حوالہ دیا گیا ہے کہ اُن لوگوں کو بھی ٹھیک یہی آزمایش پیش آئی تھی جس سے اب کفارِ قریش کے سرداروں کو سابقہ پڑا ہے۔ اُن کے پاس بھی ایسا ہی ایک معزّز رسول آیا تھا۔ انھوں نے بھی وہ صریح علامات اور نشانیاں دیکھ لی تھیں جن سے اُس کا مامور من اللہ ہونا صاف ظاہر ہو رہا تھا۔ وہ بھی نشانی پر نشانی دیکھتے چلے گئے مگر اپنی ضد سے باز نہ آئے۔ یہاں تک کہ آخرِ کار رسول

QuranUrdu.com

کی جان لینے کے درپے ہو گئے، اور نتیجہ وہ کچھ دیکھا جو ہمیشہ کے لیے سامانِ عبرت بن گیا۔

اس کے بعد دوسرا موضوع آخرت کا لیا گیا ہے جس سے کفارِ مکہ کو شدت کے ساتھ انکار تھا۔ وہ کہتے تھے کہ ہم نے کسی کو مرنے کے بعد دوبارہ اُٹھ کر آتے نہیں دیکھا ہے، تم اگر دوسری زندگی کے دعوے میں سچّے ہو تو اُٹھا لاؤ ہمارے باپ دادا کو۔ اس کے جواب میں عقیدۂ آخرت کی دو دلیلیں مختصر طور پر دی گئی ہیں۔ ایک، یہ کہ اس عقیدے کا انکار ہمیشہ اَخلاق کے لیے تباہ کُن ثابت ہوتا رہا ہے۔ دوسرے، یہ کہ کائنات کسی کھلنڈرے کا کھلونا نہیں ہے، بلکہ ایک حکیمانہ نظام ہے، اور حکیم کا کوئی کام عَبَث نہیں ہوتا۔ پھر کفار کے اس مطالبے کا کہ اُٹھا لاؤ ہمارے باپ دادا کو، یہ جواب دیا گیا ہے کہ یہ کام روز روز ہر ایک کے مطالبے پر نہیں ہوگا، بلکہ اس کے لیے اللہ نے ایک وقت مقرر فرما دیا ہے جب وہ تمام نوعِ انسانی کو بیک وقت جمع کرے گا اور اپنی عدالت میں ان کا مُحاسَبہ فرمائے گا۔ اُس وقت کی اگر کسی کو فکر کرنی ہو تو کر لے، کیونکہ وہاں کوئی نہ اپنے زور پر بچ سکے گا نہ کسی کے بچائے بچے گا۔

اللہ کی اس عدالت کا ذکر کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ جو لوگ وہاں مجرم قرار پائیں گے ان کا انجام کیا ہوگا، اور جو وہاں سے کامیاب ہو کر نکلیں گے وہ کیا انعام پائیں گے۔ پھر یہ کہہ کر بات ختم کر دی گئی ہے کہ تم لوگوں کو سمجھانے کے لیے یہ قرآن صاف سیدھی زبان میں اور تمھاری اپنی زبان میں نازل کر دیا گیا ہے، اب اگر تم سمجھانے سے نہیں سمجھتے اور انجامِ بد ہی دیکھنے پر مُصِر ہو تو انتظار کرو، ہمارا نبی بھی منتظر ہے، جو کچھ ہونا ہے وہ اپنے وقت پر سامنے آ جائے گا۔

آیاتہا ۵۹ سُورَةُ الدُّخَانِ مَكِّيَّةٌ رکوعاتہا ۳

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

حٰمٓ ﴿۱﴾ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ﴿۲﴾ اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا مع ۱۲
كُنَّا مُنْذِرِيْنَ ﴿۳﴾ فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ ﴿۴﴾ اَمْرًا مِّنْ
عِنْدِنَا ؕ اِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ﴿۵﴾ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ؕ اِنَّهٗ

ح ۔ م ۔ قسم ہے اِس کتابِ مُبین کی کہ ہم نے اِسے ایک بڑی خیر و برکت والی رات میں نازل کیا ہے، کیونکہ ہم لوگوں کو متنبّہ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔[1] یہ وہ رات تھی جس میں ہر معاملے کا حکیمانہ فیصلہ[2] ہمارے حکم سے صادر کیا جاتا ہے۔[3] ہم ایک رسول بھیجنے والے تھے، تیرے رب کی رحمت کے طور پر۔[4] یقیناً

۱ ۔ کتابِ مُبین کی قسم کھانے کا مطلب سورۂ زُخرُف حاشیہ نمبر۱ میں بیان کیا جا چکا ہے۔ یہاں بھی قسم جس بات پر کھائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اس کتاب کے مصنف محمد صلی اللہ علیہ وسلم نہیں ہیں بلکہ ''ہم'' ہیں، اور اس کا ثبوت کہیں اور ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں، خود یہ کتاب ہی اس کے ثبوت کے لیے کافی ہے۔ اس کے بعد مزید بات یہ فرمائی گئی کہ وہ بڑی خیر و برکت والی رات تھی جس میں اسے نازل کیا گیا۔ یعنی نادان لوگ، جنھیں اپنی بھلائی برائی کا شُعور نہیں ہے، اس کتاب کی آمد کو اپنے لیے بلائے ناگہانی سمجھ رہے ہیں اور اس سے پیچھا چھڑانے کی فکر میں غلطاں و پیچاں ہیں۔ لیکن درحقیقت ان کے لیے اور تمام نوعِ انسانی کے لیے وہ ساعت بڑی ہی سعید تھی جب ''ہم'' نے غفلت میں پڑے ہوئے لوگوں کو چونکانے کے لیے یہ کتاب نازل کرنے کا فیصلہ کیا۔

اُس رات میں قرآن نازل کرنے کا مطلب بعض مفسرین نے یہ لیا ہے کہ نُزولِ قرآن کا سلسلہ اُس رات شروع ہوا۔ اور بعض مفسرین اس کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ اس میں پورا قرآن اُمّ الکتاب سے منتقل کر کے حاملِ وحی فرشتوں کے حوالے کر دیا گیا، اور پھر وہ حالات و وقائع کے مطابق حسبِ ضرورت نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ۲۳ سال تک نازل کیا جاتا رہا۔ صحیح صورتِ معاملہ کیا ہے، اسے اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

اُس رات سے مراد وہی رات ہے جسے سورۂ قدر میں لیلۃ القدر کہا گیا ہے۔ وہاں فرمایا گیا کہ اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ، اور یہاں فرمایا گیا ہے کہ اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ۔ پھر یہ بات بھی قرآنِ مجید ہی میں بتا دی گئی ہے کہ وہ ماہِ رَمضان کی ایک رات تھی: شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْۤ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ۔ (البقرہ:۱۸۵)

۲ ۔ اصل میں لفظ ''اَمْرٍ حَكِيْمٍ'' استعمال ہوا ہے، جس کے دو معنی ہیں: ایک، یہ کہ وہ حکم سراسر حکمت پر مبنی

QuranUrdu.com

هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝٦ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا

وہی سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے[۵]، آسمانوں اور زمین کا رب اور ہر اُس چیز کا رب جو آسمان و زمین

ہوتا ہے، کسی غَلَطی یا خامی کا اُس میں کوئی امکان نہیں۔ دوسرے، یہ کہ وہ ایک پختہ اور محکم فیصلہ ہوتا ہے، اسے بدل دینا کسی کے بس میں نہیں۔

۳- سورۂ قدر میں یہی مضمون اِس طرح بیان کیا گیا ہے: تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ، ''اُس رات ملائکہ اور جبریل اپنے رب کے اِذن سے ہر طرح کا حکم لے کر اُترتے ہیں۔'' اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے شاہی نظم و نسق میں یہ ایک ایسی رات ہے جس میں وہ افراد اور قوموں اور ملکوں کی قسمتوں کے فیصلے کر کے اپنے فرشتوں کے حوالے کر دیتا ہے، اور پھر وہ انھی فیصلوں کے مطابق عمل درآمد کرتے رہتے ہیں۔ بعض مفسرین کو، جن میں حضرت عِکْرِمَہؒ سب سے زیادہ نمایاں ہیں، یہ شبہ لاحق ہوا ہے کہ یہ نصفِ شَعبان کی رات ہے، کیونکہ بعض احادیث میں اِسی رات کے متعلق یہ بات منقول ہوئی ہے کہ اس میں قسمتوں کے فیصلے کیے جاتے ہیں۔ لیکن ابنِ عباسؓ، ابنِ عمرؓ، مُجاہدؒ، قَتادَہؒ، حَسَن بصریؒ، سعید بن جُبَیرؒ، ابنِ زیدؒ، ابو مالکؒ، ضَحّاکؒ اور دوسرے بہت سے مفسرین اس بات پر متفق ہیں کہ یہ رمضان کی وہی رات ہے جسے لیلۃ القدر کہا گیا ہے، اس لیے کہ قرآنِ مجید خود اس کی تصریح کر رہا ہے، اور جہاں قرآن کی صراحت موجود ہو، وہاں اخبارِ آحاد کی بنا پر کوئی دوسری رائے نہیں قائم کی جا سکتی۔ ابنِ کثیرؒ کہتے ہیں کہ ''عثمان بن محمد کی جو رِوایَت امام زُہریؒ نے شعبان سے شعبان تک قسمتوں کے فیصلے ہونے کے متعلق نقل کی ہے وہ ایک مُرسَل رِوایَت ہے، اور ایسی رِوایات نُصوص کے مقابلے میں نہیں لائی جا سکتیں۔'' قاضی ابوبکر ابن العَرَبیؒ کہتے ہیں کہ ''نصف شعبان کی رات کے متعلق کوئی حدیث قابلِ اعتماد نہیں ہے، نہ اس کی فضیلت کے بارے میں اور نہ اس امر میں کہ اُس رات قسمتوں کے فیصلے ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان کی طرف التفات نہیں کرنا چاہیے۔'' (احکام القرآن)

۴- یعنی یہ کتاب دے کر ایک رسول کو بھیجنا نہ صرف حکمت کا تقاضا تھا، بلکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا تقاضا بھی تھا، کیونکہ وہ رب ہے اور رُبُوبیّت صرف اسی بات کی متقاضی نہیں ہے کہ بندوں کے جسم کی پرورش کا سامان کیا جائے، بلکہ اس بات کی بھی متقاضی ہے کہ علمِ صحیح سے ان کی رہنمائی کی جائے، حق و باطل کے فرق سے اُن کو آگاہ کیا جائے، اور انھیں تاریکی میں بھٹکتا نہ چھوڑ دیا جائے۔

۵- اِس سِیاق و سَباق میں اللہ تعالیٰ کی اِن دو صفات کو بیان کرنے سے مقصود لوگوں کو اِس حقیقت پر مُتَنَبِّہ کرنا ہے کہ صحیح علم صرف وہی دے سکتا ہے، کیونکہ تمام حقائق کو وہی جانتا ہے۔ ایک انسان تو کیا، سارے انسان مل کر بھی اگر اپنے لیے کوئی راہِ حیات متعیّن کریں تو اس کے حق ہونے کی کوئی ضمانت نہیں، کیونکہ پوری نوعِ انسانی یکجا ہو کر بھی ایک سمیع و علیم نہیں بنتی۔ اُس کے بس میں یہ ہے ہی نہیں کہ اُن تمام حقائق کا احاطہ کرے جن کا جاننا ایک صحیح راہ حیات متعین کرنے کے لیے ضروری ہے۔ یہ علم صرف اللہ کے پاس ہے۔ وہی سمیع و علیم ہے، اس لیے وہی یہ بتا سکتا ہے کہ انسان کے لیے ہدایت کیا ہے اور ضلالت کیا، حق کیا ہے اور باطل کیا، خیر کیا ہے اور شر کیا۔

QuranUrdu.com

وقف لازم

بَيْنَهُمَا ۚ إِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ۝٧ لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۖ
رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ۝٨ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ يَّلْعَبُوْنَ ۝٩

کے درمیان ہے، اگر تم لوگ واقعی یقین رکھنے والے ہو۔[۶] کوئی معبُود اُس کے سوا نہیں ہے[۷]۔ وہی زندگی عطا کرتا ہے اور وہی موت دیتا ہے[۸]۔ تمھارا رب اور تمھارے اُن اسلاف کا رب جو پہلے گزر چکے ہیں[۹]۔ (مگر فی الواقع اِن لوگوں کو یقین نہیں ہے) بلکہ یہ اپنے شک میں پڑے کھیل رہے ہیں[۱۰]۔

۶ – اہلِ عرب خود اقرار کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ہی کائنات اور اس کی ہر چیز کا رب (مالک و پروردگار) ہے۔ اس لیے ان سے فرمایا گیا کہ اگر تم بے سوچے سمجھے محض زبان ہی سے یہ اقرار نہیں کر رہے ہو، بلکہ تمھیں واقعی اُس کی پروردگاری کا شُعور اور اس کے مالک ہونے کا یقین ہے، تو تمھیں تسلیم کرنا چاہیے کہ (۱) انسان کی رہنمائی کے لیے کتاب اور رسول کا بھیجنا اس کی شانِ رحمت و پروردگاری کا عین تقاضا ہے، اور (۲) مالک ہونے کی حیثیت سے یہ اس کا حق اور مملوک ہونے کی حیثیت سے یہ تمھارا فرض ہے کہ اس کی طرف سے جو ہدایت آئے اسے مانو، اور جو حکم آئے اس کے آگے سرِ اطاعت جھکا دو۔

۷ – معبُود سے مراد ہے حقیقی معبُود، جس کا حق یہ ہے کہ اس کی عبادت (بندگی و پرستش) کی جائے۔

۸ – یہ دلیل ہے اس امر کی کہ اس کے سوا کوئی معبُود نہیں ہے اور نہیں ہوسکتا۔ اس لیے کہ یہ بات سراسر عقل کے خلاف ہے کہ جس نے بے جان مادّوں میں جان ڈال کر تم کو جیتا جاگتا انسان بنایا، اور جو اس امر کے کُلّی اختیارات رکھتا ہے کہ جب تک چاہے تمھاری اِس زندگی کو باقی رکھے اور جب چاہے اسے ختم کر دے، اس کی تم بندگی نہ کرو، یا اس کے سوا کسی اور کی بندگی کرو، یا اس کے ساتھ دوسروں کی بندگی بھی کرنے لگو۔

۹ – اِس میں ایک لطیف اشارہ ہے اِس امر کی طرف کہ تمھارے جن اسلاف نے اس کو چھوڑ کر دوسرے معبُود بنائے، ان کا رب بھی حقیقت میں وہی تھا۔ انھوں نے اپنے اصلی رب کے سوا دوسروں کی بندگی کر کے کوئی صحیح کام نہ کیا تھا کہ اُن کی تقلید کرنے میں تم حق بجانب ہو اور ان کے فعل کو اپنے مذہب کے دُرست ہونے کی دلیل ٹھیرا سکو۔ اُن کو لازم تھا کہ وہ صرف اُسی کی بندگی کرتے، کیونکہ وہی ان کا رب تھا۔ لیکن اگر انھوں نے ایسا نہیں کیا تو تمھیں لازم ہے کہ سب کی بندگی چھوڑ کر اسی ایک کی بندگی اختیار کرو، کیونکہ وہی تمھارا رب ہے۔

۱۰ – اِس مختصر سے فقرے میں ایک بڑی اہم حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ دَہریّے ہوں یا مشرکین، ان سب پر وقتاً فوقتاً ایسی ساعتیں آتی رہتی ہیں جب ان کا دل اندر سے کہتا ہے کہ جو کچھ تم سمجھے بیٹھے ہو، اس میں کہیں نہ کہیں جھول موجود ہے۔ دَہریّہ اپنے انکارِ خدا میں بظاہر خواہ کتنا ہی سخت ہو، کسی نہ کسی وقت اس کا دل یہ شہادت دے گزرتا ہے کہ خاک کے ایک ذرّے سے لے کر کہکشانوں تک اور گھاس کی ایک پتّی سے لے کر انسان کی تخلیق تک یہ حیرت انگیز، حکمت سے لبریز نظام کسی صانع حکیم کے بغیر وجود میں نہیں آ سکتا۔ اسی طرح ایک مشرک اپنے شرک میں خواہ کتنا ہی گہرا ڈوبا ہوا ہو، کبھی

QuranUrdu.com

فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَاْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ ۙ﴿۱۰﴾ يَّغْشَى النَّاسَ ؕ
هٰذَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۱﴾ رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ اِنَّا مُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲﴾
اَنّٰى لَهُمُ الذِّكْرٰى وَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ ۙ﴿۱۳﴾ ثُمَّ تَوَلَّوْا
عَنْهُ وَقَالُوْا مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ ﴿۱۴﴾ اِنَّا كَاشِفُوا الْعَذَابِ قَلِيْلًا

وقف لازم

اچھا، انتظار کرو اُس دن کا جب آسمان صریح دھواں لیے ہوئے آئے گا اور وہ لوگوں پر چھا جائے گا، یہ ہے دردناک سزا۔ (اب کہتے ہیں کہ) "پروردگار! ہم پر سے یہ عذاب ٹال دے، ہم ایمان لاتے ہیں۔" اِن کی غفلت کہاں دُور ہوتی ہے؟ اِن کا حال تو یہ ہے کہ اِن کے پاس رسولِ مُبین آ گیا[11]، پھر بھی یہ اُس کی طرف مُلتفت نہ ہوئے اور کہا کہ "یہ تو سکھایا پڑھایا باولا ہے[12]۔" ہم ذرا عذاب ہٹائے دیتے ہیں،

نہ کبھی اس کا دل بھی یہ پکار اُٹھتا ہے کہ جنھیں میں معبُود بنائے بیٹھا ہوں یہ خدا نہیں ہو سکتے۔ لیکن اِس قلبی شہادت کا نتیجہ نہ تو یہ ہوتا ہے کہ انھیں خدا کے وجود اور اس کی توحید کا یقین حاصل ہو جائے، نہ یہی ہوتا ہے کہ انھیں اپنے شرک اور اپنی دَہریّت میں کامل یقین و اطمینان حاصل رہے۔ اِس کے بجائے اُن کا دین درحقیقت شک پر قائم ہوتا ہے، خواہ اُس میں یقین کی کتنی ہی شدت وہ دکھا رہے ہوں۔ اب رہا یہ سوال کہ یہ شک ان کے اندر بے چینی کیوں نہیں پیدا کرتا، اور وہ سنجیدگی کے ساتھ حقیقت کی جستجو کیوں نہیں کرتے کہ یقین کی اطمینان بخش بنیاد انھیں مل سکے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دین کے معاملے میں سنجیدگی ہی سے تو وہ محروم ہوتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں اصل اہمیّت صرف دنیا کی کمائی اور اس کے عیش کی ہوتی ہے، جس کی فکر میں وہ اپنے دل اور دماغ اور جسم کی ساری طاقتیں خرچ کر ڈالتے ہیں۔ رہے دین کے مسائل، تو وہ حقیقت میں ان کے لیے ایک کھیل، ایک تفریح، ایک ذہنی عیاشی کے سوا کچھ نہیں ہوتے، جن پر سنجیدگی کے ساتھ چند لمحے بھی وہ غور و فکر میں صَرف نہیں کر سکتے۔ مذہبی مراسم ہیں تو تفریح کے طور پر ادا کیے جا رہے ہیں۔ انکار و دَہریّت کی بحثیں ہیں تو تفریح کے طور پر کی جا رہی ہیں۔ دنیا کے مشاغل سے اتنی فرصت کسے ہے کہ بیٹھ کر یہ سوچے کہ کہیں ہم حق سے منحرف تو نہیں ہیں، اور اگر حق سے منحرف ہیں تو اس کا انجام کیا ہے۔

۱۱ - رسولِ مُبین کے دو مطلب ہیں: ایک، یہ کہ اس کا رسول ہونا اُس کی سیرت، اُس کے اَخلاق و کردار اور اُس کے کارناموں سے بالکل عیاں ہے۔ دوسرے، یہ کہ اس نے حقیقت کو کھول کھول کر بیان کرنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی ہے۔

۱۲ - اُن کا مطلب یہ تھا کہ یہ بے چارا تو سیدھا سادھا آدمی تھا، کچھ دوسرے لوگوں نے اِسے بھڑوں پر چڑھا لیا، وہ در پردہ قرآن کی آیتیں گھڑ گھڑ کر اسے پڑھا دیتے ہیں، یہ آ کر عام لوگوں کے سامنے انھیں پیش کر دیتا ہے، وہ مزے سے بیٹھے رہتے ہیں، اور یہ گالیاں اور پتھر کھاتا ہے۔ اِس طرح ایک چلتا ہوا فقرہ کہہ کر وہ اُن ساری دلیلوں اور نصیحتوں اور سنجیدہ تعلیمات کو اُڑا دیتے

QuranUrdu.com

وقف لازم

اِنَّكُمْ عَآئِدُوْنَ ﴿۱۵﴾ يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى ۚ اِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ ﴿۱۶﴾

تم لوگ پھر وہی کچھ کرو گے جو پہلے کر رہے تھے۔ جس روز ہم بڑی ضرب لگائیں گے وہ دن ہوگا جب ہم تم سے انتقام لیں گے۔[۱۳]

تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم برسوں سے ان کے سامنے پیش کر کر کے تھکے جا رہے تھے۔ وہ نہ ان معقول باتوں پر کوئی توجہ کرتے تھے جو قرآنِ مجید میں بیان کی جا رہی تھیں، نہ یہ دیکھتے تھے کہ جو شخص یہ باتیں پیش کر رہا ہے وہ کس پایے کا آدمی ہے، اور نہ یہ الزام رکھتے وقت ہی وہ کچھ سوچنے کی زحمت گوارا کرتے تھے کہ ہم یہ کیا بکواس کر رہے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ اگر کوئی دوسرا شخص در پردہ بیٹھ کر سکھانے پڑھانے والا ہوتا تو وہ حضرت خدیجہؓ اور ابوبکرؓ اور علیؓ اور زیدؓ بن حارثہ اور دوسرے ابتدائی مسلمانوں سے آخر کیسے چھپ جاتا جن سے بڑھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب اور ہر وقت کا ساتھی کوئی نہ تھا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ یہی لوگ سب سے بڑھ کر حضورؐ کے گرویدہ اور عقیدت مند تھے، حالانکہ در پردہ کسی دوسرے شخص کے سکھانے پڑھانے سے نبوت کا کاروبار چلایا گیا ہوتا تو یہی لوگ آپؐ کی مخالفت میں سب سے پیش پیش ہوتے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، النحل، حاشیہ ۱۰۷۔ جلد سوم، الفرقان، حاشیہ ۱۲)

۱۳ – اِن آیات کے مفہوم میں مفسرین کے درمیان بڑا اختلاف واقع ہوا ہے، اور یہ اختلاف صحابۂ کرامؓ کے زمانے میں بھی پایا جاتا تھا۔ حضرت عبداللہؓ بن مسعود کے مشہور شاگرد مَسْرُوقؒ کہتے ہیں کہ ایک روز ہم کوفے کی مسجد میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ ایک واعظ لوگوں کے سامنے تقریر کر رہا ہے۔ اس نے آیت يَوْمَ تَاْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ پڑھی، پھر کہنے لگا: جانتے ہو یہ کیسا دھواں ہے؟ یہ دھواں قیامت کے روز آئے گا اور کفار و منافقین کو اندھا بہرا کر دے گا، مگر اہلِ ایمان پر اس کا اثر بس اس قدر ہوگا کہ جیسے زکام لاحق ہو گیا ہو۔ اُس کی یہ بات سُن کر ہم حضرت عبداللہؓ بن مسعود کے پاس گئے اور ان سے واعظ کی یہ تفسیر بیان کی۔ حضرت عبداللہؓ لیٹے ہوئے تھے۔ یہ تفسیر سُن کر گھبرا کے اُٹھ بیٹھے اور کہنے لگے کہ آدمی کو علم نہ ہو تو اسے جاننے والوں سے پوچھ لینا چاہیے۔ اصل بات یہ ہے کہ جب قریش کے لوگ اسلام قبول کرنے سے انکار اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرتے ہی چلے گئے تو حضورؐ نے دعا کی کہ خدایا! یوسف علیہ السلام کے قحط جیسے قحط سے میری مدد فرما۔ چنانچہ ایسا شدید کال پڑا کہ لوگ ہڈیاں اور چمڑا اور مُردار تک کھا گئے۔ اُس زمانے میں حالت یہ تھی کہ جو شخص آسمان کی طرف دیکھتا تھا اُسے بھوک کی شدت میں بس دھواں ہی دھواں نظر آتا تھا۔ آخر کار ابوسفیان نے آ کر حضورؐ سے کہا کہ آپؐ تو صلۂ رحمی کی دعوت دیتے ہیں۔ آپؐ کی قوم بھوکوں مر رہی ہے۔ اللہ سے دعا کیجیے کہ اس مصیبت کو دور کر دے۔ یہی زمانہ تھا جب قریش کے لوگ کہنے لگے تھے کہ خدایا! ہم پر سے یہ عذاب دُور کر دے تو ہم ایمان لے آئیں گے۔ اسی واقعے کا ذکر ان آیات میں کیا گیا ہے۔ اور بڑی ضرب سے مراد وہ ضرب ہے جو آخر کار جنگِ بدر کے روز قریش کو لگائی گئی۔ یہ رِوایت امام احمد، بخاری، ترمذی، نسائی، ابنِ جریر اور ابنِ ابی حاتم نے متعدِّد سندوں کے ساتھ مَسْرُوقؒ سے نقل کی ہے۔ اور مَسْرُوقؒ کے علاوہ ابراہیم نَخَعیؒ، قَتَادَہؒ، عاصمؒ اور عامرؒ کا بھی یہی بیان ہے کہ حضرت عبداللہؓ بن مسعود نے اِس آیت کی یہ تفسیر ارشاد فرمائی تھی۔ اس لیے اس امر میں کوئی شک

QuranUrdu.com

نہیں رہتا کہ حضرتِ موصوف کی رائے فی الواقع یہی تھی۔ تابعین میں سے مجاہد، قَتادَہ، ابوالعالیہ، مُقاتِل، ابراہیم النَّخَعی، ضَحّاک اور عَطِیَّہ العَوفی وغیرہ حضرات نے بھی اس تفسیر میں حضرت عبداللہؓ بن مسعود سے اتفاق کیا ہے۔

دوسری طرف حضرت علیؓ، ابنِ عمرؓ، ابنِ عباسؓ، ابوسعید خُدریؓ، زید بن علیؒ اور حَسَن بصریؒ جیسے اکابر کہتے ہیں کہ ان آیات میں سارا ذکر قیامت کے قریب زمانے کا کیا گیا ہے اور وہ دھواں جس کی خبر دی گئی ہے، اُسی زمانے میں زمین پر چھائے گا۔ مزید تقویت اِس تفسیر کو اُن رِوایات سے ملتی ہے جو خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں۔ حُذَیفہؓ بن اَسِید الغِفاری کہتے ہیں کہ ایک روز ہم قیامت کے متعلق آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔ اتنے میں حضورؐ برآمد ہوئے اور فرمایا: قیامت قائم نہ ہوگی جب تک دس علامات یکے بعد دیگرے ظاہر نہ ہولیں گی: سورج کا مغرب سے طُلُوع ہونا، دھواں، دابّہ، یاجوج وماجوج کا خُروج، عیسٰی ابنِ مریمؑ کا نُزول، زمین کا دھنسنا مشرق میں، مغرب میں اور جزیرۃ العرب میں، اور عدن سے آگ کا نکلنا جو لوگوں کو ہانکتی ہوئی لے جائے گی۔ (مسلم) اسی کی تائید ابو مالک اَشْعَریؓ کی وہ رِوایَت کرتی ہے جسے ابنِ جَرِیر اور طَبَرانی نے نقل کیا ہے، اور ابوسعید خُدْرِیؓ کی رِوایَت جسے ابنِ ابی حاتم نے نقل کیا ہے۔ ان دونوں رِوایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دھویں کو علاماتِ قیامت میں شمار کیا ہے، اور یہ بھی حضورؐ نے فرمایا ہے کہ وہ دھواں جب چھائے گا تو مومن پر اس کا اثر صرف زکام جیسا ہوگا، اور کافر کی نس نس میں وہ بھر جائے گا اور اس کے ہر مَنْفَذ سے نکلے گا۔

اِن دونوں تفسیروں کا تعارُض اُوپر کی آیات پر غور کرنے سے بآسانی رفع ہوسکتا ہے۔ جہاں تک حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی تفسیر کا تعلق ہے، یہ اَمرِ واقعہ ہے کہ مکّۂ معظّمہ میں حضورؐ کی دعا سے سخت قحط رُونما ہوا تھا جس سے کفار کے خَنّے بہت کچھ ڈھیلے پڑ گئے تھے، اور انھوں نے اسے رفع کرانے کے لیے حضورؐ سے دعا کی درخواست کی تھی۔ اِس واقعے کی طرف قرآنِ مجید میں متعدِّد مَقامات پر اشارے کیے گئے ہیں۔ (مُلاحَظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، الاَنعام، حاشیہ ۲۹۔ جلد دوم، الاعراف، حاشیہ ۷۷، یونُس، حواشی ۱۴-۱۵-۲۹۔ جلد سوم، المومنون، حاشیہ ۷۲) ان آیات میں بھی صاف محسوس ہوتا ہے کہ اشارہ اُسی صورتِ حال کی طرف ہے۔ کفار کا یہ کہنا کہ "پروردگار! ہم پر سے یہ عذاب ٹال دے، ہم ایمان لاتے ہیں۔" اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ "اِن کی غفلت کہاں دُور ہوتی ہے جب کہ ان کے پاس رسولِ مُبین آ گیا، پھر بھی یہ اس کی طرف مُلتَفِت نہ ہوئے اور کہا کہ یہ تو سکھایا پڑھایا باؤلا ہے۔" پھر یہ فرمانا کہ "ہم ذرا عذاب ہٹائے دیتے ہیں، تم لوگ پھر وہی کچھ کرو گے جو پہلے کر رہے تھے۔" یہ ساری باتیں اُسی صورت میں راست آ سکتی ہیں جب کہ واقعہ حضورؐ ہی کے زمانے کا ہو۔ قیامت کے قریب ہونے والے واقعات پر ان کا اِطلاق بعید اَز فہم ہے۔ اس لیے اس حد تک تو ابنِ مسعودؓ کی تفسیر ہی صحیح معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اُس کا یہ حصّہ صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ "دھواں" بھی اُسی زمانے میں ظاہر ہوا تھا، اور اس شکل میں ظاہر ہوا تھا کہ بھوک کی شدت میں جب لوگ آسمان کی طرف دیکھتے تھے تو دھواں ہی دھواں نظر آتا تھا۔ یہ بات قرآنِ مجید کے ظاہر الفاظ سے بھی مطابقت نہیں رکھتی، اور احادیث کے بھی خلاف ہے۔ قرآن میں یہ کہاں کہا گیا ہے کہ آسمان دھواں لیے ہوئے آ گیا اور لوگوں پر چھا گیا۔ وہاں تو کہا گیا ہے کہ "اچھا تو اُس دن کا انتظار کرو جب آسمان صریح دھواں لیے ہوئے آئے گا اور وہ لوگوں پر چھا جائے گا۔" بعد کی آیات کو نگاہ میں رکھ کر دیکھا جائے تو اس ارشاد کا صاف مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب تم نہ رسول کے سمجھانے سے مانتے ہو، نہ قحط کی شکل میں جو تنبیہ تمھیں کی گئی ہے اُس سے ہی ہوش میں آتے ہو، تو پھر قیامت

QuranUrdu.com

وَلَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ وَجَآءَهُمْ رَسُوْلٌ كَرِيْمٌ ﴿۱۷﴾ اَنْ اَدُّوْٓا
اِلَيَّ عِبَادَ اللّٰهِ ؕ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿۱۸﴾ وَّاَنْ لَّا تَعْلُوْا عَلَى اللّٰهِ ۚ اِنِّيْٓ
اٰتِيْكُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۹﴾ وَاِنِّيْ عُذْتُ بِرَبِّيْ وَرَبِّكُمْ اَنْ تَرْجُمُوْنِ ﴿۲۰﴾

ہم اِن سے پہلے فرعون کی قوم کو اِسی آزمایش میں ڈال چکے ہیں۔ اُن کے پاس ایک نہایت شریف رسول[۱۴] آیا اور اس نے کہا:[۱۵] "اللہ کے بندوں کو میرے حوالے کرو،[۱۶] میں تمھارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں[۱۷]۔ اللہ کے مقابلے میں سرکشی نہ کرو۔ میں تمھارے سامنے (اپنی مامُوریّت کی) صریح سند پیش کرتا ہوں[۱۸]۔ اور میں اپنے رب اور تمھارے رب کی پناہ لے چکا ہوں اِس سے کہ تم مجھ پر حملہ آور ہو۔

کا انتظار کرو، اُس وقت جب پوری طرح شامت آئے گی تب تمھیں پتا چل جائے گا کہ حق کیا تھا اور باطل کیا تھا۔ پس جہاں تک دھویں کا تعلق ہے، اس کے بارے میں صحیح بات یہی ہے کہ وہ قحط کے زمانے کی چیز نہیں ہے بلکہ علاماتِ قیامت میں سے ہے، اور یہی بات احادیث سے بھی معلوم ہوتی ہے۔ تعجّب ہے کہ مفسرینِ کبار میں سے جنھوں نے حضرت ابنِ مسعودؓ کی تائید کی انھوں نے پوری بات کی تائید کر دی، اور جنھوں نے ان کی تردید کی انھوں نے پوری بات کی تردید کر دی، حالانکہ آیات اور احادیث پر غور کرنے سے یہ صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا کون سا حصّہ صحیح ہے اور کون سا غلط۔

۱۴ - اصل میں ''رَسُوْلٌ كَرِيْمٌ'' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ کریم کا لفظ جب انسان کے لیے بولا جاتا ہے تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ بہترین شریفانہ خصائل اور نہایت قابلِ تعریف صفات سے متصف ہے۔ معمولی خوبیوں کے لیے یہ لفظ نہیں بولا جاتا۔

۱۵ - یہ بات ابتدا ہی میں سمجھ لینی چاہیے کہ یہاں حضرت موسیٰؑ کے جو اقوال نقل کیے جا رہے ہیں وہ ایک وقت میں ایک ہی مسلسل تقریر کے اجزا نہیں ہیں، بلکہ سال ہا سال کے دَوران میں مختلف مواقع پر جو باتیں انھوں نے فرعون اور اس کے اہلِ دربار سے کہی تھیں، ان کا خلاصہ چند فقروں میں بیان کیا جا رہا ہے۔ (تفصیلات کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حواشی ۸۳ تا ۹۷، یونس، حواشی ۷۲ تا ۹۳۔ جلد سوم، طٰہٰ، حواشی ۱۸ الف تا ۵۲، الشعراء، حواشی ۷ تا ۴۹، النمل، حواشی ۸ تا ۱۷، القصص، حواشی ۴۶ تا ۵۶۔ جلد چہارم، المومن، آیات ۲۳ تا ۴۶، الزُّخرُف، ۴۶ تا ۵۶ مع حواشی)

۱۶ - اصل میں اَدُّوْٓا اِلَيَّ عِبَادَ اللّٰهِ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اِن کا ایک ترجمہ تو وہ ہے جو اُوپر ہم نے کیا ہے، اور اس کے لحاظ سے یہ اُس مطالبے کا ہم معنیٰ ہے جو سورۂ اَعراف (آیت ۱۰۵)، سورۂ طٰہٰ (۴۷) اور الشُّعَراء (۱۷) میں گزر چکا ہے کہ ''بنی اسرائیل کو میرے ساتھ جانے کے لیے چھوڑ دو۔'' دوسرا ترجمہ، جو حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منقول ہے، یہ ہے کہ ''اللہ کے بندو! میرا حق ادا کرو، یعنی میری بات مانو، مجھ پر ایمان لاؤ، اور میری ہدایت کی پیروی کرو، یہ خدا کی طرف سے تمھارے اُوپر میرا حق ہے۔''

QuranUrdu.com

وَاِنْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا لِیْ فَاعْتَزِلُوْنِ ﴿۲۱﴾ فَدَعَا رَبَّهٗۤ اَنَّ هٰۤؤُلَآءِ قَوْمٌ
مُّجْرِمُوْنَ ﴿۲۲﴾ فَاَسْرِ بِعِبَادِیْ لَیْلًا اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ﴿۲۳﴾ وَاتْرُكِ الْبَحْرَ

الثلثۃ

اگر تم میری بات نہیں مانتے تو مجھ پر ہاتھ ڈالنے سے باز رہو۔[19]'' آخرِ کار اُس نے اپنے رب کو پکارا کہ یہ لوگ مجرم ہیں۔[20] (جواب دیا گیا:) ''اچھا تو راتوں رات میرے بندوں کو[21] لے کر چل پڑ۔ تم لوگوں کا پیچھا کیا جائے گا۔[22] سمندر کو اس کے حال پر

بعد کا یہ فقرہ کہ ''میں تمھارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں'' اِس دوسرے مفہوم کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

۱۷ – یعنی بھروسے کے قابل رسول ہوں۔ اپنی طرف سے کوئی بات ملا کر کہنے والا نہیں ہوں۔ نہ اپنی کسی ذاتی خواہش یا غرض کے لیے خود ایک حکم یا قانون گھڑ کر خدا کے نام سے پیش کرنے والا ہوں۔ مجھ پر تم یہ اعتماد کر سکتے ہو کہ جو کچھ میرے بھیجنے والے نے کہا ہے، وہی بے کم و کاست تم تک پہنچاؤں گا۔ (واضح رہے کہ یہ دو فقرے اُس وقت کے ہیں جب حضرت موسیٰؑ نے سب سے پہلے اپنی دعوت پیش فرمائی تھی۔)

۱۸ – دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ میرے مقابلے میں جو سرکشی تم کر رہے ہو، یہ دراصل اللہ کے مقابلے میں سرکشی ہے، کیونکہ میری جن باتوں پر تم بگڑ رہے ہو، وہ میری نہیں بلکہ اللہ کی باتیں ہیں اور مَیں اُسی کے رسول کی حیثیت سے انھیں بیان کر رہا ہوں۔ اگر تمھیں اس میں شک ہے کہ میں اللہ کا بھیجا ہوا ہوں یا نہیں، تو میں تمھارے سامنے اپنے مامور من اللہ ہونے کی صریح سند پیش کرتا ہوں۔ اِس سند سے مراد کوئی ایک معجزہ نہیں ہے بلکہ معجزات کا وہ طویل سلسلہ ہے جو فرعون کے دربار میں پہلی مرتبہ پہنچنے کے بعد سے آخر زمانۂ قیامِ مصر تک حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون اور اس کی قوم کو سال ہا سال تک دکھاتے رہے۔ جس سند کو بھی اُن لوگوں نے جھٹلایا، اُس سے بڑھ کر صریح سند آپ پیش کرتے چلے گئے۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، الزُّخرُف، حواشی نمبر ۴۲ – ۴۳)

۱۹ – یہ اُس زمانے کی بات ہے جب حضرت موسیٰؑ کی پیش کردہ ساری نشانیوں کے مقابلے میں فرعون اپنی ہٹ پر اَڑا ہوا تھا، مگر یہ دیکھ کر کہ اِن نشانیوں سے مصر کے عوام اور خواص روز بروز مُتأثّر ہوتے چلے جا رہے ہیں، اس کے ہوش اُڑے جا رہے تھے۔ اُس زمانے میں پہلے تو اس نے بھرے دربار میں وہ تقریر کی جو سورۂ زُخرُف، آیات ۵۱ – ۵۳ میں گزر چکی ہے (مُلاحظہ ہو: حواشی سورۂ زُخرف ۴۵ تا ۴۹)، پھر زمین پاؤں تلے سے نکلتی دیکھ کر آخرِ کار وہ اللہ کے رسول کو قتل کر دینے پر آمادہ ہو گیا۔ اُس وقت آں جناب نے وہ بات کہی جو سورۂ مومن، آیت ۲۷ میں گزر چکی ہے کہ اِنِّیْ عُذْتُ بِرَبِّیْ وَرَبِّكُمْ مِّنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَّا یُؤْمِنُ بِیَوْمِ الْحِسَابِ ''میں نے پناہ لی اپنے رب اور تمھارے رب کی ہر اُس متکبر سے جو روزِ حساب پر ایمان نہیں رکھتا۔'' یہاں حضرت موسیٰؑ اپنی اُسی بات کا حوالہ دے کر فرعون اور اس کے اَعیانِ سلطنت سے فرما رہے ہیں کہ دیکھو، میں تمھارے سارے حملوں کے مقابلے میں اللہ ربّ العالمین کی پناہ مانگ چکا ہوں۔ اب تم میرا تو کچھ بگاڑ نہیں سکتے، لیکن اگر تم خود اپنی خیر چاہتے ہو تو مجھ پر حملہ آور ہونے سے باز رہو۔ میری بات نہیں مانتے تو نہ مانو۔ مجھ پر ہاتھ ہرگز نہ ڈالنا، ورنہ اِس کا بہت بُرا انجام دیکھو گے۔

QuranUrdu.com

رَهْوًا ؕ اِنَّهُمْ جُنْدٌ مُّغْرَقُوْنَ ﴿۲۴﴾ كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۲۵﴾ وَّ
زُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ ﴿۲۶﴾ وَّنَعْمَةٍ كَانُوْا فِيْهَا فٰكِهِيْنَ ﴿۲۷﴾ كَذٰلِكَ ۫ وَ
اَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ﴿۲۸﴾ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ وَ

کُھلا چھوڑ دے۔ یہ سارا لشکر غرق ہونے والا ہے۔''[۲۳] کتنے ہی باغ اور چشمے اور کھیت اور شاندار محل تھے جو وہ چھوڑ گئے۔ کتنے ہی عیش کے سروسامان، جن میں وہ مزے کر رہے تھے، اُن کے پیچھے دھرے رہ گئے۔ یہ ہوا اُن کا انجام، اور ہم نے دوسروں کو اِن چیزوں کا وارث بنا دیا۔[۲۴] پھر نہ آسمان اُن پر رویا نہ زمین،[۲۵] اور

---

۲۰ - یہ حضرت موسیٰؑ کی آخری رپورٹ ہے جو اُنھوں نے اپنے رب کے سامنے پیش کی۔ ''یہ لوگ مجرم ہیں'' یعنی اِن کا مجرم ہونا اب قطعی طور پر ثابت ہو چکا ہے۔ کوئی گنجایش اِن کے ساتھ رعایت برتنے اور ان کو اصلاحِ حال کا مزید موقع دینے کی باقی نہیں رہی ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ حضور آخری فیصلہ صادر فرمائیں۔

۲۱ - یعنی اُن سب لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں۔ ان میں بنی اسرائیل بھی تھے، اور مصر کے وہ قبطی باشندے بھی جو حضرت یوسفؑ کے زمانے سے حضرت موسیٰؑ کی آمد تک مسلمانوں میں شامل ہو چکے تھے، اور وہ لوگ بھی جنھوں نے حضرت موسیٰؑ کی نشانیاں دیکھ کر اور آپ کی دعوت و تبلیغ سے مُتأثّر ہو کر اہلِ مصر میں سے اسلام قبول کیا تھا۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، یوسف، حاشیہ ۶۸)

۲۲ - یہ ابتدائی حکم ہے جو حضرت موسیٰؑ کو ہجرت کے لیے دیا گیا تھا۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، طٰہٰ، حاشیہ ۵۳، الشعراء، حواشی ۳۹ تا ۴۷)

۲۳ - یہ حکم اُس وقت دیا گیا جب حضرت موسیٰؑ اپنے قافلے کو لے کر سمندر پار اُتر چکے تھے، اور چاہتے تھے کہ سمندر پر عصا مار کر اُسے پھر ویسا ہی کر دیں جیسا وہ پھٹنے سے پہلے تھا، تاکہ فرعون اور اس کا لشکر اُس راستے سے گزر کر نہ آ جائے جو معجزے سے بنا تھا۔ اُس وقت فرمایا گیا کہ ایسا نہ کرو۔ اس کو اِسی طرح پھٹا کا پھٹا رہنے دو، تاکہ فرعون اپنے لشکر سمیت اِس راستے میں اُتر آئے، پھر سمندر کو چھوڑ دیا جائے گا اور یہ پوری فوج غرق کر دی جائے گی۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، طٰہٰ، حواشی ۵۳ - ۵۴، الشعراء، حاشیہ ۴۷)

۲۴ - حضرت حَسَن بصریؒ کہتے ہیں کہ اس سے مراد بنی اسرائیل ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے قومِ فرعون کے بعد مصر کی سرزمین کا وارث بنا دیا۔ اور قَتادَہؒ کہتے ہیں کہ اس سے مراد دوسرے لوگ ہیں جو آلِ فرعون کے بعد مصر کے وارث ہوئے، کیونکہ تاریخوں میں کہیں بھی یہ ذکر نہیں ملتا کہ مصر سے نکلنے کے بعد بنی اسرائیل کبھی وہاں واپس گئے ہوں اور اس سرزمین کے وارث ہوئے ہوں۔ یہی اختلاف بعد کے مفسرین میں بھی پایا جاتا ہے۔ (تفصیلی بحث کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، الشعراء، حاشیہ ۴۵)

QuranUrdu.com

ع ۱۴ ۲۹

مَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ ﴿٢٩﴾ وَلَقَدْ نَجَّيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنَ الْعَذَابِ
الْمُهِيْنِ ﴿٣٠﴾ مِنْ فِرْعَوْنَ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَالِيًا مِّنَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿٣١﴾ وَلَقَدِ
اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰي عِلْمٍ عَلَي الْعٰلَمِيْنَ ﴿٣٢﴾ وَاٰتَيْنٰهُمْ مِّنَ الْاٰيٰتِ مَا فِيْهِ

ذرا سی مُہلت بھی ان کو نہ دی گئی۔ ع اس طرح بنی اسرائیل کو ہم نے سخت ذلّت کے عذاب، فرعون[26] سے نجات دی، جو حد سے گزر جانے والوں میں فی الواقع بڑے اُونچے درجے کا آدمی تھا[27]، اور ان کی حالت جانتے ہوئے اُن کو دنیا کی دوسری قوموں پر ترجیح دی[28]، اور انھیں ایسی نشانیاں دکھائیں جن میں صریح

۲۵ – یعنی جب وہ حکمراں تھے تو اُن کی عظمت کے ڈنکے بج رہے تھے، اُن کی حمد وثنا کے ترانوں سے دنیا گونج رہی تھی۔ خوشامدیوں کے جمگھٹے ان کے آگے اور پیچھے لگے رہتے تھے، ان کی وہ ہوا باندھی جاتی تھی کہ گویا ایک عالَم اُن کے کمالات کا گرویدہ اور ان کے احسانات کا زیر بار ہے اور ان سے بڑھ کر دنیا میں کوئی مقبول نہیں، مگر جب وہ گرے تو کوئی آنکھ ان کے لیے رونے والی نہ تھی، بلکہ دنیا نے ایسا اطمینان کا سانس لیا کہ گویا ایک کانٹا تھا جو اس کے پہلو سے نکل گیا۔ ظاہر ہے کہ انھوں نے نہ خلقِ خدا کے ساتھ کوئی بھلائی کی تھی کہ زمین والے ان کے لیے روتے، نہ خدا کی خوشنودی کا کوئی کام کیا تھا کہ آسمان والوں کو ان کی ہلاکت پر افسوس ہوتا۔ جب تک مَشیّتِ الٰہی سے ان کی رسّی دراز ہوتی رہی، وہ زمین کے سینے پر مونگ دَلتے رہے۔ جب ان کے جرائم حد سے گزر گئے تو اس طرح اُٹھا کر پھینک دیے گئے جیسے کُوڑا کرکٹ پھینکا جاتا ہے۔

۲۶ – یعنی فرعون بجائے خود اُن کے لیے ذلّت کا عذاب تھا اور دوسرے تمام عذاب اسی ایک عذابِ مجسّم کے شاخسانے تھے۔

۲۷ – اس میں ایک لطیف طنز ہے کفارِ قریش کے سرداروں پر۔ مطلب یہ ہے کہ حدِّ بندگی سے تجاوُز کر جانے والوں میں تمھارا مرتبہ اور مَقام ہی کیا ہے۔ بڑے اُونچے درجے کا سرکش تو وہ تھا جو اُس وقت دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کے تخت پر خدائی کا رُوپ دھارے بیٹھا تھا۔ اُسے جب خس وخاشاک کی طرح بہا دیا گیا تو تمھاری کیا ہستی ہے کہ قہرِ الٰہی کے آگے ٹھیر سکو۔

۲۸ – یعنی بنی اسرائیل کی خوبیاں اور کمزوریاں، دونوں اللہ پر عیاں تھیں۔ اُس نے بے دیکھے بھالے اُن کا انتخاب اندھا دُھند نہیں کر لیا تھا۔ اُس وقت دنیا میں جتنی قومیں موجود تھیں اُن میں سے اِس قوم کو جب اُس نے اپنے پیغام کا حامل اور اپنی توحید کی دعوت کا عَلَم بردار بنانے کے لیے چُنا تو اس بنا پر چُنا کہ اُس کے علم میں وقت کی موجود قوموں میں سے یہی اس کے لیے موزوں تر تھی۔

QuranUrdu.com

بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مُّبِيْنٍ ﴿۳۳﴾ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَيَقُوْلُوْنَ ﴿۳۴﴾ اِنْ هِيَ اِلَّا مَوْتَتُنَا الْاُوْلٰى
وَمَا نَحْنُ بِمُنْشَرِيْنَ ﴿۳۵﴾ فَاْتُوْا بِاٰبَآئِنَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۶﴾ اَهُمْ
خَيْرٌ اَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ ۙ وَّالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ اَهْلَكْنٰهُمْ ۖ اِنَّهُمْ كَانُوْا
مُجْرِمِيْنَ ﴿۳۷﴾ وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا

آزمائش تھی۔[۲۹]

یہ لوگ کہتے ہیں: "ہماری پہلی موت کے سوا اَور کچھ نہیں، اُس کے بعد ہم دوبارہ اُٹھائے جانے والے نہیں ہیں[۳۰]۔ اگر تم سچّے ہو تو اُٹھا لاؤ ہمارے باپ دادا کو[۳۱]۔" یہ بہتر ہیں یا تُبَّع کی قوم[۳۲] اور اُس سے پہلے کے لوگ؟ ہم نے ان کو اِسی بنا پر تباہ کیا کہ وہ مجرم ہو گئے تھے[۳۳]۔ یہ آسمان و زمین اور اِن کے درمیان کی چیزیں

---

۲۹ - تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حواشی ۶۴ تا ۸۵، النساء، حواشی ۱۸۲ تا ۱۹۹، المائدہ، حواشی ۴۲ تا ۴۷۔ جلد دوم، الاعراف، حواشی ۹۷ تا ۱۳۲۔ جلد سوم، طٰہٰ، حواشی ۵۶ تا ۷۴۔

۳۰ - یعنی پہلی دفعہ جب ہم مریں گے تو بس فنا ہو جائیں گے، اس کے بعد پھر کوئی زندگی نہیں ہے۔ "پہلی موت" کے الفاظ سے یہ لازم نہیں آتا کہ اُس کے بعد کوئی دوسری موت بھی ہو۔ ہم جب یہ کہتے ہیں کہ فُلاں شخص کے ہاں پہلا بچہ پیدا ہوا، تو اس قول کے صادق ہونے کے لیے یہ ضروری نہیں ہوتا کہ اس کے بعد لازماً دوسرا بچہ پیدا ہو، بلکہ صرف یہ کافی ہوتا ہے کہ اس سے پہلے کوئی بچہ نہ ہوا ہو۔

۳۱ - اِن کا اِستدلال یہ تھا کہ ہم نے کبھی مرنے کے بعد کسی کو دوبارہ جی اُٹھتے نہیں دیکھا ہے، اس لیے ہم یقین رکھتے ہیں کہ مرنے کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں ہو گی۔ تم لوگ اگر دعویٰ کرتے ہو کہ دوسری زندگی ہو گی تو ہمارے اجداد کو قبروں سے اُٹھا لاؤ، تاکہ ہمیں زندگی بعدِ موت کا یقین آ جائے۔ یہ کام تم نے نہ کیا تو ہم سمجھیں گے کہ تمھارا دعویٰ بے بنیاد ہے۔ یہ گویا اُن کے نزدیک حیات بعد الموت کی تردید میں بڑی پختہ دلیل تھی۔ حالانکہ سراسر مُہمَل تھی۔ آخر ان سے یہ کہا کس نے تھا کہ مرنے والے دوبارہ زندہ ہو کر اسی دنیا میں واپس آئیں گے؟ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم یا کسی مسلمان نے یہ دعویٰ کب کیا تھا کہ ہم مُردوں کو زندہ کرنے والے ہیں؟

۳۲ - تُبَّع قبیلۂ حِمْیَر کے بادشاہوں کا لقب تھا، جیسے کِسریٰ، قیصر، فرعون وغیرہ القاب مختلف مَمالک کے بادشاہوں کے لیے مخصوص رہے ہیں۔ یہ لوگ قومِ سَبا کی ایک شاخ سے تعلق رکھتے تھے۔ ۱۱۵ قبلِ مسیح میں اِن کو سَبا کے ملک پر غلبہ حاصل ہوا اور ۳۰۰ء تک یہ حکمراں رہے۔ عرب میں صدیوں تک اِن کی عظمت کے افسانے زبان زدِ خلائق

QuranUrdu.com

لٰعِبِيْنَ ﴿۳۸﴾ مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۹﴾
اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ مِيْقَاتُهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۴۰﴾ يَوْمَ لَا يُغْنِيْ مَوْلًى

ہم نے کچھ کھیل کے طور پر نہیں بنا دی ہیں۔ اِن کو ہم نے برحق پیدا کیا ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔[۳۴] اِن سب کے اُٹھائے جانے کے لیے طے شدہ وقت فیصلے کا دن ہے،[۳۵] وہ دن جب کوئی عزیز قریب اپنے

رہے ہیں۔ (تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، سورۂ سبا، حاشیہ نمبر ۳۷)

۳۳- یہ کفار کے اعتراض کا پہلا جواب ہے۔ اس جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ انکارِ آخرت وہ چیز ہے جو کسی شخص، گروہ یا قوم کو مجرم بنائے بغیر نہیں رہتی۔ اَخلاق کی خرابی اس کا لازمی نتیجہ ہے، اور تاریخِ انسانی شاہد ہے کہ زندگی کے اس نظریّے کو جس قوم نے بھی اختیار کیا ہے وہ آخرِ کار تباہ ہو کر رہی ہے۔ رہا یہ سوال کہ "یہ بہتر ہیں یا تُبَّع کی قوم اور اس سے پہلے کے لوگ؟" اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کفارِ مکہ تو اس خوشحالی اور شوکت و حشمت کو پہنچ بھی نہیں سکے ہیں جو تُبَّع کی قوم، اور اس سے پہلے سبا اور قومِ فرعون اور دوسری قوموں کو حاصل رہی ہے۔ مگر یہ مادّی خوشحالی اور دُنیوی شان و شوکت اَخلاقی زوال کے نتائج سے اُن کو کب بچا سکی تھی کہ یہ اپنی ذرا سی پونجی اور اپنے ذرائع و وسائل کے بل بُوتے پر ان سے بچ جائیں گے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، سورۂ سبا، حواشی ۲۵-۳۶)

۳۴- یہ ان کے اعتراض کا دوسرا جواب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص بھی حیات بعد الموت اور آخرت کی جزا و سزا کا منکر ہے، وہ دراصل اِس کارخانۂ عالَم کو کھلونا اور اس کے خالق کو نادان بچہ سمجھتا ہے، اِسی بنا پر اس نے یہ رائے قائم کی ہے کہ انسان دنیا میں ہر طرح کے ہنگامے برپا کر کے ایک روز بس یوں ہی مٹی میں رَل مِل جائے گا، اور اُس کے کسی اچھے یا بُرے کام کا کوئی نتیجہ نہ نکلے گا۔ حالانکہ یہ کائنات کسی کھلنڈرے کی نہیں بلکہ ایک خالق حکیم کی بنائی ہوئی ہے، اور کسی حکیم سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ فعلِ عَبَث کا ارتکاب کرے گا۔ انکارِ آخرت کے جواب میں یہ اِستدلال قرآنِ مجید میں متعدِّد مقامات پر کیا گیا ہے، اور ہم اس کی مفصل تشریح کر چکے ہیں۔ (ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، الاَنعام، حاشیہ ۴۶۔ جلد دوم، یونُس، حواشی ۱۰-۱۱۔ جلد سوم، الانبیاء، حواشی ۱۶-۱۷، المومنون، حواشی ۱۰۱-۱۰۲، الروم، حواشی ۴ تا ۱۰)

۳۵- یہ اُن کے اِس مطالبے کا جواب ہے کہ "اُٹھا لاؤ ہمارے باپ دادا کو اگر تم سچّے ہو۔" مطلب یہ ہے کہ زندگی بعدِ موت کوئی تماشا تو نہیں ہے کہ جہاں کوئی اس سے انکار کرے، فوراً ایک مُردہ قبرستان سے اُٹھا کر اس کے سامنے لا کھڑا کیا جائے۔ اس کے لیے تو ربّ العالمین نے ایک وقت مقرر کر دیا ہے جب تمام اوّلین و آخرین کو وہ دوبارہ زندہ کر کے اپنی عدالت میں جمع کرے گا اور ان کے مُقدّمات کا فیصلہ صادر فرمائے گا۔ تم مانو چاہے نہ مانو، یہ کام بہرحال اپنے وقتِ مقرر پر ہی ہوگا۔ تم مانو گے تو اپنا ہی بھلا کرو گے، کیونکہ اس طرح قبل از وقت خبردار ہو کر اُس عدالت سے کامیاب نکلنے کی تیاری کر سکو گے۔ نہ مانو گے تو اپنا ہی نقصان کرو گے، کیونکہ اپنی ساری عمر اِس غلط فہمی میں کھپا دو گے کہ بُرائی اور بھلائی جو کچھ بھی ہے بس اسی دنیا کی زندگی تک ہے،

QuranUrdu.com

عَنْ مَّوْلًى شَيْـًٔا وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۱﴾ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ اللّٰهُ ؕ اِنَّهٗ
هُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۴۲﴾ اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ ﴿۴۳﴾ طَعَامُ
الْاَثِيْمِ ﴿۴۴﴾ كَالْمُهْلِ ۚ يَغْلِيْ فِي الْبُطُوْنِ ﴿۴۵﴾ كَغَلْيِ الْحَمِيْمِ ﴿۴۶﴾ معانقة ۱۴
خُذُوْهُ فَاعْتِلُوْهُ اِلٰى سَوَآءِ الْجَحِيْمِ ﴿۴۷﴾ ثُمَّ صُبُّوْا فَوْقَ رَاْسِهٖ
مِنْ عَذَابِ الْحَمِيْمِ ﴿۴۸﴾ ذُقْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ ﴿۴۹﴾

کسی عزیز قریب [۳۶] کے کچھ بھی کام نہ آئے گا اور نہ کہیں سے انھیں کوئی مدد پہنچے گی، سوائے اِس کے کہ اللہ ہی کسی پر رحم کرے، وہ زبردست اور رحیم ہے۔ [۳۷] ع

زقّوم [۳۸] کا درخت گناہ گار کا کھاجا ہوگا، تیل کی تلچھٹ [۳۹] جیسا، پیٹ میں اِس طرح جوش کھائے گا جیسے کھولتا ہوا پانی جوش کھاتا ہے۔ "پکڑو اِسے اور رگیدتے ہوئے لے جاؤ اِس کو جہنّم کے بیچوں بیچ، اور انڈیل دو اِس کے سر پر کھولتے پانی کا عذاب۔ چکھ اس کا مزا، بڑا زبردست عزت دار آدمی ہے تُو۔

مرنے کے بعد پھر کوئی عدالت نہیں ہونی ہے جس میں ہمارے اچھے یا بُرے اعمال کا کوئی مستقل نتیجہ نکلنا ہو۔

۳۶- اصل میں لفظ "مولیٰ" استعمال کیا گیا ہے جو عربی زبان میں ایسے شخص کے لیے بولا جاتا ہے جو کسی تعلق کی بنا پر دوسرے شخص کی حمایت کرے، قطعِ نظر اس سے کہ وہ رشتہ داری کا تعلق ہو، یا دوستی کا، یا کسی اور قسم کا۔

۳۷- ان فقروں میں بتایا گیا ہے کہ فیصلے کے دن جو عدالت قائم ہوگی اُس کا کیا رنگ ہوگا۔ کسی کی مدد یا حمایت وہاں کسی مجرم کو نہ چھڑا سکے گی، نہ اس کی سزا کم ہی کرا سکے گی۔ کُلّی اختیارات اس حاکمِ حقیقی کے ہاتھ میں ہوں گے جس کے فیصلے کو نافذ ہونے سے کوئی طاقت روک نہیں سکتی، اور جس کے فیصلے پر اثر انداز ہونے کا بل بُوتا کسی میں نہیں ہے۔ یہ بالکل اس کے اپنے اختیارِ تمیزی پر موقوف ہوگا کہ کسی پر رحم فرما کر اس کو سزا نہ دے یا کم سزا دے، اور حقیقت میں اُس کی شان یہی ہے کہ انصاف کرنے میں بے رحمی سے نہیں بلکہ رحم ہی سے کام لے۔ لیکن جس کے مُقدّمے میں جو فیصلہ بھی وہ کرے گا، وہ بہرحال بے کم و کاست نافذ ہوگا۔ عدالتِ الٰہی کی یہ کیفیت بیان کرنے کے بعد آگے کے چند فقروں میں بتایا گیا ہے کہ اُس عدالت میں جو لوگ مجرم ثابت ہوں گے ان کا انجام کیا ہوگا، اور جن لوگوں کے بارے میں یہ ثابت ہو جائے گا کہ وہ دنیا میں خدا سے ڈر کر نافرمانیوں سے پرہیز کرتے رہے تھے، ان کو کن انعامات سے سرفراز کیا جائے گا۔

۳۸- زقّوم کی تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، سورۂ صافّات، حاشیہ ۳۴۔

QuranUrdu.com

اِنَّ هٰذَا مَا كُنْتُمْ بِهٖ تَمْتَرُوْنَ ﴿۵۰﴾ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ ﴿۵۱﴾
فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۵۲﴾ يَّلْبَسُوْنَ مِنْ سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ
مُّتَقٰبِلِيْنَ ﴿۵۳﴾ كَذٰلِكَ ۛ وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ﴿۵۴﴾ يَدْعُوْنَ
فِيْهَا بِكُلِّ فَاكِهَةٍ اٰمِنِيْنَ ﴿۵۵﴾ لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا الْمَوْتَ

یہ وہی چیز ہے جس کے آنے میں تم لوگ شک رکھتے تھے۔"

خدا ترس لوگ امن کی جگہ[۴۰] میں ہوں گے۔ باغوں اور چشموں میں، حریر و دیبا[۴۱] کے لباس پہنے، آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔ یہ ہوگی ان کی شان۔ اور ہم گوری گوری آہو چشم عورتیں[۴۲] ان سے بیاہ دیں گے۔ وہاں وہ اطمینان سے ہر طرح کی لذیذ چیزیں طلب کریں[۴۳] گے۔ وہاں موت کا مزا وہ کبھی نہ چکھیں گے،

۳۹- اصل میں لفظ "اَلْمُهْلِ" استعمال ہوا ہے، جس کے کئی معنٰی ہیں: پگھلی ہوئی دھات، پیپ، لہو، پگھلا ہوا تارکول، لاوا، تیل کی تلچھٹ۔ یہ مختلف معنٰی اہلِ لغت اور مفسرین نے بیان کیے ہیں۔ لیکن اگر زَقُّوم سے مراد وہی چیز ہے جسے ہمارے ہاں تھوہر کہتے ہیں، تو اس کو چبانے سے جو رس نکلے گا، اغلب یہی ہے کہ وہ تیل کی تَلچھَٹ سے مشابہ ہوگا۔

۴۰- امن کی جگہ سے مراد ایسی جگہ ہے جہاں کسی قسم کا کھٹکا نہ ہو۔ کوئی غم، کوئی پریشانی، کوئی خطرہ اور اندیشہ، کوئی مَشَقَّت اور تکلیف لاحق نہ ہو۔ حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اہلِ جنت سے کہہ دیا جائے گا کہ یہاں تم ہمیشہ تندرست رہو گے کبھی بیمار نہ ہو گے، ہمیشہ زندہ رہو گے کبھی نہ مرو گے، ہمیشہ خوشحال رہو گے کبھی خستہ حال نہ ہو گے، ہمیشہ جوان رہو گے کبھی بوڑھے نہ ہو گے۔" (مسلم بروایتِ ابوہُریرہؓ و ابوسعید خُدریؓ)

۴۱- اصل میں سُنْدُس اور اِسْتَبْرَق کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ سُنْدُس عربی زبان میں باریک ریشمی کپڑے کو کہتے ہیں۔ اور اِسْتَبْرَق فارسی لفظ ستبر کا مُعَرَّب ہے، اور یہ دبیز ریشمی کپڑے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

۴۲- اصل الفاظ ہیں: حُوْرٌ عِيْنٌ۔ حُور جمع ہے حَورا کی، اور حَورا عربی زبان میں گوری عورت کو کہتے ہیں۔ اور عِین جمع ہے عَینا کی، اور یہ لفظ بڑی بڑی آنکھوں والی عورت کے لیے بولا جاتا ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، الصّافّات، حاشیہ ۲۶ و ۲۹)

۴۳- "اطمینان سے" طلب کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جو چیز جتنی چاہیں گے، بے فکری کے ساتھ جنت کے خادموں کو اس کے لانے کا حکم دیں گے اور وہ حاضر کر دی جائے گی۔ دنیا میں کوئی شخص ہوٹل تو درکنار، خود اپنے گھر میں اپنی چیز بھی اس اطمینان سے طلب نہیں کر سکتا جس طرح وہ جنت میں طلب کرے گا۔ کیونکہ یہاں کسی چیز کے بھی اتھاہ ذخیرے کسی کے

QuranUrdu.com

إِلَّا الْمَوْتَةَ الْأُولَىٰ ۚ وَوَقَاهُمْ عَذَابَ الْجَحِيمِ ﴿٥٦﴾ فَضْلًا
مِّن رَّبِّكَ ۚ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿٥٧﴾ فَإِنَّمَا يَسَّرْنَاهُ بِلِسَانِكَ
لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿٥٨﴾ فَارْتَقِبْ إِنَّهُم مُّرْتَقِبُونَ ﴿٥٩﴾ ع ۲ ۱۷ ۱۲

بس دنیا میں جو موت آ چکی سو آ چکی۔ اور اللہ اپنے فضل سے ان کو جہنّم کے عذاب سے بچا دے گا، یہی بڑی کامیابی ہے۔

اَے نبیؐ! ہم نے اِس کتاب کو تمھاری زبان میں سہل بنا دیا ہے، تاکہ یہ لوگ نصیحت حاصل کریں۔ اب تم بھی انتظار کرو، یہ بھی منتظر ہیں۔[۴۵] ع

پاس نہیں ہوتے، اور جو چیز بھی آدمی استعمال کرتا ہے اُس کی قیمت بہرحال اُس کی اپنی جیب ہی سے جاتی ہے۔ جنت میں مال اللہ کا ہوگا اور بندے کو اس کے استعمال کی کھلی اجازت ہوگی۔ نہ کسی چیز کے ذخیرے ختم ہو جانے کا خطرہ ہو گا، نہ بعد میں بِل پیش ہونے کا کوئی سوال۔

۴۴ - اس آیت میں دو باتیں قابلِ توجہ ہیں:

ایک یہ کہ جنت کی نعمتوں کا ذکر کرنے کے بعد جہنّم سے بچائے جانے کا ذکر خاص طور پر الگ فرمایا گیا ہے، حالاں کہ کسی شخص کا جنت میں پہنچ جانا آپ سے آپ اس امر کو مُستَلزِم ہے کہ وہ جہنّم میں جانے سے بچ گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فرماں برداری کے انعام کی قدر انسان کو پوری طرح اسی وقت محسوس ہو سکتی ہے جب کہ اس کے سامنے یہ بات بھی ہو کہ نافرمانی کرنے والے کہاں پہنچے ہیں، اور وہ کس بُرے انجام سے بچ گیا ہے۔

دوسری قابلِ توجہ بات اس میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے جہنم سے بچنے اور جنت میں پہنچنے کو اپنے فضل کا نتیجہ قرار دے رہا ہے۔ اس سے انسان کو اس حقیقت پر مُتَنَبّہ کرنا مقصود ہے کہ یہ کامیابی کسی شخص کو نصیب نہیں ہو سکتی جب تک اللہ کا فضل شاملِ حال نہ ہو۔ اگرچہ آدمی کو انعام اس کے اپنے حُسنِ عمل ہی پر ملے گا، لیکن اوّل تو حُسنِ عمل ہی کی توفیق آدمی کو اللہ کے فضل کے بغیر کیسے نصیب ہو سکتی ہے۔ پھر جو بہتر سے بہتر عمل بھی آدمی سے بن آ سکتا ہے، وہ کبھی کامل و اکمل نہیں ہو سکتا جس کے متعلق دعوے سے یہ کہا جا سکے کہ اس میں نقص کا کوئی پہلو نہیں ہے۔ یہ اللہ ہی کا فضل ہے کہ وہ بندے کی کمزوریوں اور اس کے عمل کی خامیوں کو نظر انداز کر کے اُس کی خدمات کو قبول فرما لے اور اسے انعام سے سرفراز فرمائے۔ ورنہ باریک بینی کے ساتھ حساب کرنے پر وہ اُتر آئے تو کس کی یہ ہمت ہے کہ اپنی قوتِ بازو سے جنت جیت لینے کا دعویٰ کر سکے۔ یہی بات ہے جو حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہوئی ہے۔ آپؐ نے فرمایا: اعملوا وسدّدوا وقاربوا واعلموا اَنّ احدًا لن یُّدخلهُ عمله الجنّة۔ ”عمل کرو اور اپنی حدِ استطاعت تک زیادہ سے زیادہ ٹھیک کام کرنے کی کوشش کرو، مگر یہ جان لو کہ کسی شخص کو

QuranUrdu.com

محض اس کا عمل ہی جنت میں نہ داخل کر دے گا۔'' لوگوں نے عرض کیا: ''یا رسولؐ اللہ! کیا آپؐ کا عمل بھی؟'' فرمایا: وَلَا اَنَا اِلَّا اَنْ یتغمّدنی اللّٰہ بِرَحْمَتِہٖ، ''ہاں، میں بھی محض اپنے عمل کے زور سے جنت میں نہ پہنچ جاؤں گا، اِلّا یہ کہ مجھے میرا رب اپنی رحمت سے ڈھانک لے۔''

۴۵ - یعنی اب اگر یہ لوگ نصیحت قبول نہیں کرتے تو دیکھتے رہو کہ ان کی کس طرح شامت آتی ہے، اور یہ بھی منتظر ہیں کہ دیکھیں تمھاری اس دعوت کا کیا انجام ہوتا ہے۔